© rasailojaraid.com

ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے رحمٰن

تعلیمی مسئلہ کے چند پہلو

خطبہ جلسۂ تقسیم اسناد پنجاب یونی ورسٹی

جناب جسٹس ایس۔ اے رحمٰن، جج سپریم کورٹ آف پاکستان نے اس خطبہ میں ہماری تعلیم سے متعلق چند مفید تجاویز پیش کی ہیں جن کی ضرورت و اہمیت کے پیشِ نظر یہ خطبہ شائع کیا جا رہا ہے۔

جنابِ وائس چانسلر، خواتین و حضرات!

مَیں اسے اپنے لیے باعثِ صد افتخار سمجھتا ہوں کہ مجھے اس جلسۂ تقسیم اسناد میں اپنے ناچیز خیالات کے اظہار کا موقع عطا ہوا۔ میرے جذباتِ تشکر و امتنان اور گہرے ہو جاتے ہیں جب مَیں یہ سوچتا ہوں کہ میں نے اسی مادرِ علمی کے سایۂ عاطفت میں اپنی طالب علمی کی منزلیں طے کی تھیں، اور اس مرحلہ سے گذرنے کے بعد گذشتہ بیس برس سے میں اسی یونی ورسٹی کی انتظامیہ سے وابستہ ہوں۔ مَیں اس اعزاز بخشی کے لیے جنابِ چانسلر، رفیقِ قدیم جناب حمید احمد خاں وائس چانسلر اور یونیورسٹی کی منتظمہ کے ساتھی ارکان کا تہ دل سے سپاس گذار ہوں۔

خواتین و حضرات!

جلسۂ تقسیم اسناد ہر سال منعقد ہوتا ہے۔ ایسے موقعہ پر دستگیر ہاتھوں کا مسرت آمیز لرزہ، نوجوان دلوں کی دھڑکتی امیدوں اور امنگوں کا غماز ہوتا ہے۔ میری دعا ہے کہ کامیاب طلبہ کی برسوں کی محنت کا پھل انھیں راس آئے، اور وہ مستقبل میں اپنے فکر و عمل سے پنجاب یونیورسٹی کا نام روشن کریں۔ لیکن جہاں یہ تقریب ان خوش آیند خیالات کا موجب ہوتی ہے، وہیں یہ ہم سب کے لیے ایک لمحۂ فکریہ بھی مہیا کرتی ہے۔ طلبہ کے ذہنوں میں یہ سوال کروٹ لیتا ہے کہ سال بھر میں انھوں نے کیا کھویا، کیا پایا۔ اربابِ بست و کشاد کا احساسِ منصب انھیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ کہاں تک قوم کے نونہالوں کی نسبت اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکے ہیں۔ یہ خود محاسبہ ہم سب کے لیے مفید ہو سکتا ہے کیوں کہ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے اصلاح و ترقی کی راہیں کھلتی ہیں۔ مَیں نے بھی اسی جذبہ کے ماتحت گروپشیں کا جائزہ لے کر تعلیمی مسئلہ کے چند ایک پہلوؤں پر اظہارِ خیال کی جسارت کی ہے۔

ایک زمانہ ایسا تھا کہ جب ہمارے نظامِ تعلیم میں مسجد و مدرسہ کی تفریق نہ تھی۔ اس وقت کے فارغ التحصیل دینی و دنیاوی دونوں قسم کے علوم پر عبور رکھتے تھے۔ ریاست و معاشرہ کے سربرآوردہ لوگ انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ہماری اخلاقی اور دینی اقدار سے بھی مضبوط رشتہ رکھتے تھے لیکن حالات نے پلٹا کھایا اور کل کے حاکم غیروں کے محکوم بن گئے۔ اجنبی اقتدار کے تصادم سے جو تبدیلیاں آئیں ان سے ہماری معلومات میں بے شک اضافہ ہوا اور صدیوں کے عقلی جمود کے بعد ہم علم و دانش کے ترقی پذیر نظریہ سے دوبارہ آشنا ہوئے۔ ساتھ ہی ہمارے سماج میں انتشار پیدا ہوا۔ ہمارے روایتی علوم کے علم بردار تو بسم اللہ کے گنبد میں بند ہو کر بیٹھ گئے، اور بدلتے ہوئے ماحول سے آنکھیں بند کر کے الحاد کے تھپیڑوں کا مقابلہ طعن و تشنیع یا تکفیر کے فتووں سے کرنے لگے۔ دوسری طرف نوجوان نسل کی آنکھیں مغربی ثقافت کی سطحی دل فریبیوں سے ایسی چندھیائیں کہ ہر بات میں جدت پرستی ان کا شعار بن گئی۔ فقیہ و مُلا کی ناخوش اندیشی نے انھیں دین بیزاری کی حدوں تک پہنچا دیا۔ ان دو طبقوں کے بُعد نے تعلیمی نظام پر بھی اپنا اثر ڈالا اور بظاہر دو دبستانِ تعلیم ساتھ ساتھ جاری ہو گئے جن میں سے ایک دینی علوم کے لیے وقف تھا اور دوسرا دنیاوی علوم کا نام لیوا۔ یہ تقسیم و تفریق ملتِ بیضا کے مفاد کے منافی تھی اور ہے۔ اس مرض کا علاج یہی ہے کہ پُرانی قسم کے مدرسوں کے نصاب میں عصرِ حاضر کی ضرورتوں کے عکاس مضامین، مثلاً تاریخ، اقتصادیات، عمرانیات، سیاسیات، مبادیاتِ سائنس اور ایک آدھ غیر ملکی زبان، شامل کیے جائیں، اور سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامی اصولوں اور قدروں کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے۔ بے شک اس بارے میں اقدامات ہوئے ہیں، لیکن غالباً وہ ہمارے ملی مقاصد کی پیش رفت کے لیے ناکافی ہیں۔ لازم ہے کہ کافی سوچ بچار کے بعد ان تمام کوششوں کو ایک منظم منصوبہ کے تحت لایا جائے، تاکہ ذہنی افق کی وسعت کے ساتھ ساتھ قومی سالمیت کی اہمیت واضح ہوتی رہے۔

مَیں اس ضمن میں عرض کروں گا کہ ہمارے اساتذہ اور ہمارے طلبہ دونوں میں تاریخی شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی سیاسی عمر تو زیادہ نہیں، لیکن اس کی ثقافتی عمر کافی طویل ہے۔ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے پس منظر میں مسلمانوں کی چودہ سو سالوں کی تہذیب اور مدنیت ہے۔ ہمارا ملک ایک نظریاتی مملکت ہے جو اسلامی اقدار کی اساس پر قائم ہوا تھا اور یہی اس کے وجود کا جواز تھا۔ ہماری قومی شخصیت تبھی نکھر سکتی ہے جب کہ ہماری نوجوان نسل کی جڑیں ہماری اپنی ثقافتی سرزمین میں مضبوط ہوں بیسویں صدی میں اسلامی اصولوں کو اپناتے ہوئے ہمیں کسی معذرتی انداز کا سہارا نہیں چاہیے اور نہ ہمیں کسی احساسِ کمتری کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کی ضرورت ہے۔ اسلامی قدریں درحقیقت آفاقی اور کائناتی قدریں ہیں۔ اسلام کا منتہیٰ و مقصود ملتِ انسانی کا قیام ہے۔ اس کے توحید اور مساوات کے عالمگیر اصول نسل، رنگ اور زبان کی حدبندیوں سے بالا ہیں۔ اس کا حرکی تصوّرِ حیات جدید سائنس کے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ اور دنیا و عقبیٰ دونوں کی بہبود کا ضامن ہے۔ زمان و مکان کی تغیّر پذیریاں ہمیں ہراساں نہیں کر سکتیں یہ تو حقیقت میں آیاتِ الٰہی ہیں اور ہم قرآن کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں ہر نئے مسئلہ کا حل دریافت کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ہم قدامت پرستی اور تنگ نظری کا شکار نہ ہو جائیں۔ ہمیں اپنی اجتہادی بصیرتوں کو پھر سے بروئے کار لانا ہے تاکہ زندہ خدا کی ہر دم نئی شان، نئی آن کے تخلیقی تقاضے انسانوں کی دنیا میں پورے ہوتے رہیں۔ ہمارے معاشرہ کا یہی وہ پہلو ہے جہاں ہمارے تعلیمی نظام کی صلاحیتیں آزمائی جائیں گی اس صورت میں سائنسی علوم میں ترقی کے ساتھ ساتھ اقدارِ اسلامی کے شعور کا عام کرنا ہماری تعلیم کا ایک اہم جزو قرار پاتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم میں سے ہر پڑھے لکھے فرد کو اپنے دین کی مبادیات یعنی قرآنی اصولوں سے واقف ہونا چاہیے۔ علمِ دین پر کسی ایک طبقہ کی اجارہ داری اسلام کی جمہوری روح کے منافی ہے، کیوں کہ یہ ایک قسم کی برہمنیت کی پرورش ہوگی۔ کہا گیا ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ ایک نظریاتی مملکت میں بسنے والوں کی امتیازی خصوصیات غالباً شعورِ ذات، شعورِ کائنات اور شعورِ خالقِ حیات ہی سے تعبیر ہو سکتی ہیں۔ ہمیں اسی ہمہ گیر شعور کے زریں تار کو اپنے تعلیمی تانے بانے میں سمو دینا چاہیے۔ اگر ہم نے اپنے نونہالوں کو ان کے ثقافتی ورثے سے محروم رکھا تو وہ اس عالمی انتشار کے زمانے میں یوسفِ بے کارواں ہو کر رہ جائیں گے۔

دنیا اس وقت ایک عظیم آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے۔ نظریات کی سرد جنگ ہی سوہانِ روح نہیں بلکہ بعض خطّوں میں قوموں کے درمیان مہلک جنگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ اہلِ خرد وم بخود ہیں کہ ایک قسم کا توازنِ دہشت ہی اس آن امنِ عالم کا ضامن معلوم ہوتا ہے۔ ایٹمی توانائی کی دوڑ میں بڑے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور چھوٹے ملک ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی سر توڑ کوششیں کر رہے ہیں۔ سائنسی علوم جن سے انسانی بہبود کی خاطر تسخیرِ کائنات کا کام لیا جاتا تھا، شیطانی آلاتِ موت کے غلام بن رہے ہیں۔ اگر کسی ایک جانب سے کوئی قیامت خیز ایٹمی دھماکہ شروع ہوا تو ربع مسکوں کی دھجیاں فضائے بسیط میں اُڑتی ہوئی نظر آئیں گی اور یوں انسانی علوم کے شہ کار کا انسانی خودکشی کے لیے استعمال، مسجودِ ملائک پر فطرت کا ایک بھرپور طنز بن جائے گا۔ انسانوں کی بستی اس وقت ایک روحانی بحران سے دوچار ہے۔ روحِ عصر پیچ و تاب میں ہے کہ کیسے اور کہاں سے وہ اسمِ اعظم ہاتھ آئے جس کی برکت سے ذہنِ انسانی پر سے طاغوتی طاقتوں کا منحوس سایہ اُٹھ جائے۔ یہ منطقی نتیجہ ہے۔ اس لادینی سیاست کا جس نے مغربی ممالک کو مدت سے اپنے چنگل میں گرفتار کر رکھا ہے۔ دنیا کے معاملات میں ذاتِ باری پر ایمان کے حیات افروز عنصر کا فقدان ہی قافلۂ زندگی کو اس نازک موڑ پر لے آیا ہے۔ مغرب میں ان تاریخی عوامل کے زیرِ اثر جس ذہنیت کی تربیت ہو رہی ہے اس کا پرتو ادب و فن پر بھی پڑا ہے، اور قنوطیت، کلبیت، عریانیت اور انتشار کی چھاپ ان پر لگ چکی ہے۔ تاہم یہ بات کسی قدر دلچسپی کا باعث ہے کہ مغرب کی لاادریت کی تہ میں شعوری نہیں تو غیر شعوری طور پر ایک دین کے لیے اضطراب کروٹیں لیتا نظر آتا ہے۔ دورِ حاضرہ کے وجودی مصنفین کی تحریروں میں صلیب اور کفارہ کی علامتوں کا استعمال اس حقیقت کا غماز ہے۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ ہمارے اکثر ذکی نوجوان مصنفین بھی پیرویِ مغرب کر کے اس منفی رَو میں بہ گئے ہیں۔ یہ بات تشویش انگیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلامی مثبت نظریۂ حیات سے دُور ہوتے جا رہے ہیں، جس کی پیدا کردہ مدنیت کی تعریف علامہ اقبالؒ نے ان لفظوں میں کی ہے ؎

نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں

ہمارے مغرب زدہ نوجوان بھول گئے ہیں کہ مغرب کے یہ ذہنی کوائف ان کے مخصوص حالات کا ثمرہ ہیں اور بغیر ان تجربات سے گذرے جو مغربی اہلِ قلم کے حصہ میں آئے، اُن کے فکری نظام کو اپنا لینا ادبی خلوص کا منہ چڑانا ہے۔ اس بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر ہمارے اکثر ذہین فارغ التحصیل یہ روش اختیار کر رہے ہیں تو یہ بھی ہمارے ادارۂ تعلیم کی ایک نوع کی ناکامی ہے۔ تعلیمی اداروں کا تعلق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاشرہ سے بہت گہرا ہوتا ہے، کیوں کہ تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے جس سے انفرادی کردار اور اجتماعی شخصیت دونوں کی تربیت ہوتی ہے۔ مثالی حالات میں مدرسہ اقدارِ حیات کے مشترک اجتماعی ذخیرہ کو نئی نسل تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ جماعتی نظریہ کی وضاحت کرنا اور اس کو گہرائی بخشنا اس کا وظیفہ ہے۔ ایک حد تک یہ روایات اور ثقافتِ حاضرہ کا ناقد بھی ہے تاکہ صالح اور غیر صالح عناصر میں تمیز ہو سکے۔ تعلیمی تجربہ اُن تاریخی تجربات سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے جو اور زمانوں اور مکانوں میں ہو چکے ہیں لیکن اس تجربہ کی روح مادی و ذہنی اجتماعی ماحول سے بیگانہ نہیں ہو سکتی۔ یہی روح معاشرہ کے مقاصد کا آلہ کار ہے۔ خالص دانش پروری مدرسہ کے ادنیٰ مقاصد میں سے ہے۔ اس کا اعلیٰ مقصد نوسیرت کی تعمیر ہے جس کا تعلق ذہن سے زیادہ قلب و نظر سے ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ:

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم

یہ دل و نظر کی رفاقت تعلیمِ سلیم ہی سے میسّر آ سکتی ہے جس کی بنیاد کسی عظیم نصب العین پر رکھی گئی ہو یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمیں ایک عظیم نصب العین اسلامی اقدارِ زندگی کی صورت میں عطا ہوا ہے جس کے ساتھ دین و دنیا دونوں کی بھلائی وابستہ ہے۔ ہم اس گراں بہا اثاثہ کو نفعِ حیات کی قیمت پر ہی نظر انداز کر سکتے ہیں۔

نصب العینی سطح سے نیچے اُتر کر بھی میری دانست میں تعلیمی نظام میں ترمیم و اصلاح کے امکانات موجود ہیں۔ مثلاً اگر ایک پاکستانی طالب علم انگریزی ادب میں تخصّص حاصل کرنا چاہتا ہے تو کیا یہ قرینِ صواب نہ ہوگا کہ جہاں وہ شیکسپیئر، ملٹن یا ایلیٹ کا نکتہ شناس ہو وہیں میرؔ، غالبؔ، حالیؔ، اکبرؔ اور اقبالؒ کا بھی رسیا ہو؟ میری ناچیز رائے میں ایم۔اے انگریزی کے نصاب میں مغربی پاکستان میں ایک پرچہ اردو ادب سے متعلق بھی ہونا چاہیے، تاکہ طلبہ انگریزی اور قومی ادب کا تقابلی مطالعہ کر سکیں۔ اس اقدام سے نہ صرف زاویۂ نگاہ بدلنے کی توقع کی جا سکتی ہے بلکہ قومی زبان کو باثروت یا باوقار بنانے کی راہیں بھی ہموار ہوں گی۔ اسی طرح سے سائنس، اقتصادیات، تاریخ، علم نباتات اور فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم کو ہمارے مخصوص تاریخی ورثہ سے ربط دے کر ہمارے قومی شعور کے حلقہ میں لایا جا سکتا ہے۔ اس طریقہ سے قدامت پسند طبقہ کی جدید علوم سے مغایرت کا احساس بھی رفع کیا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عصرِ حاضر سائنس کا دور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے، اور اگر ہمیں ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش کھڑا ہونا ہے تو سائنسی علوم میں اعلیٰ سے اعلیٰ تر تعلیم کا اہتمام ہمیں لازمی طور پر کرنا ہوگا۔ ان مضامین کے نصابوں کو نئے سرے سے مدوّن کر کے مغربی تعلیمی اداروں کے معیار تک پہنچانا وقت کی اہم ضرورت ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم زندگی کے مادّی پہلوؤں کو سنوار کر مہذب بنتے بنتے روحِ حیات کے تقاضوں سے بے خبر ہو جائیں۔ اسی احساس کے پیشِ نظر میں نے اپنی سوچ بچار کا ماحصل پیشِ خدمت کیا ہے۔ اگر میری یہ ناچیز گزارشات مضامین متذکرہ بالا کے نصاب ساز اداروں میں بار پا سکیں تو شاید نوجوان ذہنیتوں میں خوشگوار تبدیلی کے امکانات روشن ہو جائیں۔

آخر میں مَیں چند الفاظ بصد ادب اپنے نوجوان دوستوں کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ جب مَیں اخباروں میں پڑھتا ہوں کہ طلبہ کی جماعتوں کی طرف سے امتحانوں میں سہولتیں اور نصاب میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے مہمیں تیار کی جا رہی ہیں تو مجھے ایک گونہ افسوس ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نوجوان بہ استثنائے چند ذوق و شوقِ علم پر حصولِ سند کو فضیلت دیتے ہیں۔ تعلیمی سند بے شک عملی دنیا میں ایک کارآمد دستاویز ہے اور اکثر صورتوں میں کسبِ معیشت کی کفیل لیکن فی نفسہٖ یہ مقصودِ تعلیم نہیں ہو سکتی تعلیم کا اصل منتہیٰ تو انفرادی اور اجتماعی شخصیت کی تکمیل ہے۔ اگر ہمیں اپنے اسلاف کے علمی کارناموں کا کچھ پاس ہے اور ہم اس شاندار روایت کو پھر سے زندہ کرنا چاہتے ہیں، تو ہمارے نوجوانوں کو سخت کوشی اور جفاطلبی کو اپنانا ہوگا۔ انھیں علم و ہنر سے بھرپور لگن سائنس اور ٹیکنالوجی کے طفیل سمٹی ہوئی دنیا میں، دوسروں سے ہر میدان میں سبقت لے جانے کے جذبہ سے سرشار ہونا چاہیے۔ انھیں محض کتاب خواں نہیں بلکہ صاحبِ کتاب ہونا ہے تاکہ ان میں سے ہر ایک ملّت کے مقدر کا ستارہ بن کر آسمانِ دہر پر چمکے:

تری دُعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دُعا ہے تری آرزو بدل جائے

پاکستان پائندہ باد!

© rasailojaraid.com